تکبر اور اُس کا انجام

مؤلف

حضرت مولانا اعجاز احمد صاحب اعظمیؒ

(م: ۲۸؍ستمبر ۲۰۱۳ء)

(بانی: مدرسہ سراج العلوم، چھپرہ، ضلع مئو، یوپی)

FBD
فرید بُک ڈپو (پرائیویٹ) لمیٹڈ

تکبر اور اس کا انجام

مولف

حضرت مولانا اعجاز احمد صاحب اعظمیؒ (م: ۲۸؍ستمبر ۲۰۱۳ء)
(بانی: مدرسہ سراج العلوم، چھپرہ، ضلع مئو یوپی)

ناشر

مکتبہ ضیاء الکتب، خیرآباد، ضلع مئو (یوپی)
پن کوڈ:276403 موبائل:9235327576

تفصیلات

نام کتاب : تکبر اور اس کا انجام
مؤلف : حضرت مولانا اعجاز احمد صاحب اعظمی علیہ الرحمہ
صفحات : 24
طبع اول : ۲۰۰۶ء
طبع دوم : ۲۰۱۵ء
ناشر : مکتبہ ضیاء الکتب، خیر آباد، ضلع مئو (یوپی)
قیمت : 30/=

ملنے کے پتے

☆ فرید بک ڈپو پٹودی ہاؤس، دریا گنج، نئی دہلی ۲
☆ کتب خانہ نعیمیہ دیوبند
☆ مکتبہ ضیاء الکتب، مدرسہ سراج العلوم چھپرہ ضلع مئو یوپی 9235327576
☆ مکتبہ الفہیم صدر چوک مئو ناتھ بھنجن 9236761926
☆ مولانا محمد خالد قاسمی مکتبہ دار ارقم، اسلام آباد (ڈکہا) جون پور 9554983430

یہ مضمون درس قرآن کی ایک تقریر ہے، جو غازی پور میں ۱۴۰۲ھ (۱۹۸۲ء) میں کی گئی، اسے اسی وقت ٹیپ ریکارڈ میں محفوظ کرلیا گیا، اور اسی زمانہ میں یہ تقریر رسالہ کی شکل میں شائع بھی ہوئی، اور اب نایاب ہے، اس کی اہمیت کے پیش نظر اسے اب دوبارہ شائع کیا جارہا ہے، اللہ تعالیٰ اسے نافع بنائیں۔

أَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

تِلْکَ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِيْنَ لَا يُرِيْدُوْنَ عُلُوّاً فِی الْاَرْضِ وَلَا فَسَاداً وَّالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ، مَنْ جَاءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ خَيْرٌ مِّنْهَا وَمَنْ جَاءَ بِالسَّيِّئَةِ فَلَا يُجْزَى الَّذِيْنَ عَمِلُوا السَّيِّئَاتِ إِلَّا مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ۔

(سورۃ القصص: ۸۴/۸۵)

یہ عالم آخرت ہم ان لوگوں کے لئے خاص کرتے ہیں جو دنیا میں نہ بڑا بننا چاہتے ہیں اور نہ فساد کرنا، اور نیک نتیجہ متقیوں کے لئے ہے، جو شخص نیکی لے کر آوے گا اس کو اس سے بہتر ملے گا، اور جو شخص بدی لے کر آوے گا سو ایسے لوگوں کو جو بدی کا کام کرتے تھے اتنا ہی بدلہ ملے گا جتنا وہ کرتے تھے۔

اوپر قارون کا ذکر تھا، جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ: **إِنَّ قَارُوْنَ كَانَ مِنْ قَوْمِ مُوْسٰى فَبَغٰى عَلَيْهِمْ**، قارون موسیٰ کی قوم ہی کا ایک فرد تھا، اس نے اپنی قوم پر سرکشی کی۔ اس کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ نے اسے زمین میں دھنسا دیا، اور جیسا کہ حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ قیامت تک دھنستا چلا جائے گا۔ یہ آیت اسی واقعہ کے

ساتھ مربوط ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ دارِ آخرت ہم انھیں لوگوں کے لئے خاص کرتے ہیں جو دنیا میں بڑا بننا نہیں چاہتے، دنیا میں فساد کرنا نہیں چاہتے، یہ دونوں باتیں قارون کے اندر تھیں۔ بڑا بھی بننا چاہتا تھا اور فساد بھی کرتا تھا۔ چنانچہ اس کی قوم نے نصیحت کی تھی کہ: **وَلاَ تَبۡغِ الۡفَسَادَ فِی الۡاَرۡضِ** کہ زمین میں فساد نہ مچاؤ، آفت مت برپا کرو، لیکن وہ نہیں مانا، بڑا بھی بننا چاہا اور زمین میں فساد بھی مچایا، اس کے نتیجے میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے اسے ہلاک کیا۔ یہاں یہ فرماتے ہیں کہ دارِ آخرت جو کہ جنت ہے، انھیں لوگوں کو ملتا ہے جو نہ دنیا میں بڑا بننا چاہتے ہیں اور نہ فساد مچاتے ہیں۔ اب یہاں یہ بات سمجھنے کی ہے کہ ایک تو یہ کہ انسان بڑا بننا چاہے، اور ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ ہی اسے بڑا بنا دیں، دونوں میں فرق ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے خاص بندوں کی صفت یہ ارشاد فرمائی ہے: **وَعِبَادُ الرَّحۡمٰنِ الَّذِیۡنَ یَمۡشُوۡنَ عَلَی الۡاَرۡضِ هَوۡناً وَّاِذَا خَاطَبَهُمُ الۡجَاهِلُوۡنَ قَالُوۡا سَلاماً**۔ رحمٰن کے خاص بندے وہ ہیں جو زمین پر تواضع کے ساتھ چلتے ہیں، سکون کے ساتھ چلتے ہیں، وہ بڑا بننا نہیں چاہتے، اور جب کوئی جاہل، ضدی اور سرکش آدمی خطاب کرنا چاہتا ہے، بات کرتا ہے تو وہ یہ کہہ کر ٹال دیتے ہیں کہ تم جاؤ ہم تمہارے ساتھ لگنا اور لڑنا نہیں چاہتے ایسی بات کرتے ہیں جس سے شر دفع ہو جائے، جس سے کوئی خرابی اور فساد پیدا نہ ہو۔ تو ایک ہے زمین پر بڑا بننا، جس کا نام شریعت کی اصطلاح میں تکبر ہے۔ متکبرین کے لئے اللہ تعالیٰ نے آخرت میں جنت نہیں لکھی ہے۔ حدیث میں آتا ہے کہ: لَایَدۡخُلُ الۡجَنَّةَ مَنۡ کَانَ فِی قَلۡبِهٖ مِثۡقَالُ حَبَّةٍ مِّنۡ خَرۡدَلٍ مِنۡ کِبۡرٍ۔ وہ شخص جس کے دل میں رائی کے دانے کے برابر بھی تکبر ہوگا، وہ جنت میں نہ جائے گا۔

جنت سے وہ شخص محروم ہوگا جس کے دل میں کبر ہوگا، ہمارے زمانہ کا یہ خاص مرض ہے، بلکہ میں اگر یہ کہوں کہ دو مرض ہیں اس زمانے کے جو آپس میں لازم وملزوم ہیں تو غلط نہ ہوگا۔ ایک تو کبر ہے، اور پھر اس کبر کے نتیجے میں غصّہ ہے۔ ہر آدمی بڑا بننا چاہتا ہے،

چھوٹا آدمی بھی اپنے کو بڑا ہی سمجھنے کی کوشش کرتا ہے، اور یہی سمجھتا ہے کہ ہم بڑے ہیں۔ تواضع اختیار کرنا، اللہ کے لئے پستی اختیار کرنا، خدا کے واسطے اپنے کو جھکا دینا، اپنے کو چھوٹا سمجھنا، اس کو آدمی سمجھتا ہے کہ ذلت ہے، اور اس سے آدمی احساسِ کمتری میں مبتلا ہو جاتا ہے، اس لئے ہر انسان کو چاہئے کہ احساسِ برتری اختیار کرلے، اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ اپنے کو بڑا سمجھے اور یہ سمجھے کہ ہم کس سے کم ہیں، ہم ایسے ہیں، ہم ویسے ہیں، ہم کسی سے کم نہیں ہیں، حالانکہ قرآن وحدیث کی تعلیم یہ ہے کہ آدمی اپنے کو چھوٹا سمجھے، ہوگا وہ اپنی جگہ بڑا ہی، لیکن اسے حق نہیں کہ اپنے کو بڑا سمجھے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے سب سے بڑا بنایا ہے نبی کریم ﷺ کو، سب سے افضل، سب سے اعظم، سب سے بڑا، مخلوقات میں جس کی شان سب سے بڑی ہے وہ جناب نبی کریم ﷺ ہیں، لیکن آپ کی تواضع کا یہ حال تھا کہ جب صحابہ کرام کے ساتھ چلتے تھے تو آگے بڑھنے کی کوشش نہیں کرتے تھے، بلکہ انھیں میں ملے جلے چلتے تھے، صحابہ خود پاسِ ادب سے پیچھے ہو جائیں تو دوسری بات ہے، ورنہ خود نبی اکرم ﷺ کبھی آگے بڑھنے کی کوشش نہیں کرتے تھے۔ بعض صحابہ سے روایت ہے کہ جب ہمارے درمیان رسول اللہ ﷺ تشریف فرما ہوتے، اور ہمارے برابر بیٹھے ہوتے تو آپ کا زانو ہمارے زانو سے آگے نہیں بڑھتا تھا، اس طرح نہیں بیٹھتے تھے جس سے آپ کی کوئی امتیازی شان معلوم ہو۔ صحابہ کرام کی مجلس میں آپ بیٹھتے تھے تو آنے والے اجنبی شخص کو پوچھنا پڑتا تھا کہ من محمد فیکم؟ تم میں محمد کون ہیں۔ (ﷺ) اگر آپ کی کوئی امتیازی شان ہوتی تو آنے والا دیکھ کر ہی یہ سمجھ لیتا کہ یہی وہ صاحب ہیں جن کے لئے میں آیا ہوں، لیکن آپ کی کوئی خاص امتیازی شان نہیں ہوتی تھی، آپ کے پاس ایک شخص آتا ہے، آپ کو دیکھ کر تھر تھر کانپنے لگتا ہے، اس پر ہیبت چھا جاتی ہے، آپ اس سے فرماتے ہیں کہ کیوں ڈرتے ہو؟ میں اسی عورت کا بیٹا ہوں جو گوشت سکھا کر استعمال کرتی تھی، آپ نے اپنے کو اس درجہ چھوٹا ظاہر فرمایا، اس لئے تاکہ اس شخص کے دل سے آپ کی ہیبت کم

ہو جائے اور پھر جو بات کہنا چاہتا ہے اطمینان سے ظاہر کر سکے، ورنہ رسول اللہ ﷺ کے رُعب کا یہ عالم تھا کہ آپ ارشاد فرماتے ہیں کہ **نصرت بالرعب مسیرۃ شھر**، مجھے اللہ تعالیٰ نے ایسا رعب عطا فرمایا ہے کہ میرا دشمن ایک مہینے کی مسافت پر ہو تب بھی اس کے دل میں میرا خوف بیٹھ جاتا ہے۔

لیکن خود آپ کا عالم کیا تھا؟ ایسی مسکنت، ایسی فروتنی، ایسی عاجزی کہ بس کیا عرض کروں، حضرت عدی بن حاتم ؓ ایک صحابی ہیں، پہلے عیسائی تھے، پھر مسلمان ہوئے، جب رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو انھوں نے یہ دیکھنا چاہا کہ آپ بادشاہ ہیں یا نبی؟ یعنی آپ کے اندر بادشاہوں جیسی شان ہے یا نبوت کی شان ہے، پہلے وہ عیسائی تھے ،نبیوں کے حالات جانتے تھے، تورات وانجیل کے عالم تھے، وہ یہ معلوم کرنا چاہتے تھے کہ آپ کے اندر نبوت کی شان ہے یا بادشاہت کی شان ہے۔ فرماتے ہیں کہ میں حضور کے پاس مجلس میں بیٹھا رہا، جب آپ مجلس سے اُٹھ کر چلے تو میں بھی ساتھ ہولیا، ایک گلی میں پہونچے تو ایک بڑھیا عورت جس کے دماغ میں غالبًا کچھ کمزوری تھی، اس نے آپ سے کہا کہ یارسول اللہ! مجھے آپ سے کچھ ضروت ہے، آپ نے فرمایا کہ تمہیں جہاں بھی ضرورت ہو میں تمہارے ساتھ چلنے کے لئے تیار ہوں، میں تمہارے ساتھ چلوں گا، جو تمہاری ضرورت ہوگی پوری کروں گا۔ حضرت عدی بن حاتم نے جب یہ بات سنی تو فرماتے ہیں کہ مجھے یقین ہوگیا کہ آپ کے اندر بادشاہت کی شان نہیں ہے، آپ کے اندر نبوت والی شان ہے، کوئی بادشاہ یہ نہیں کرسکتا کہ اپنی رعایا سے کہے کہ مجھے جہاں جی چاہے لے چلو میں تمہاری ضرورت پوری کروں گا۔ وہ اپنے خدام سے، نوکر چاکر سے اور اپنے اعوان وانصار سے کہہ دے گا کہ اس کی ضرورت پوری کردو، بلکہ وہ تو سرے سے بات سننا ہی گوارا نہ کرے گا، یہاں یہ حالت ہے کہ رسول اللہ ﷺ خود اس کی ضرورت پوری کرنے کو تیار ہیں۔ دیکھئے جو سب سے بڑے ہیں جن کی عظمت سب سے زیادہ ہے، جو شریعت کی تبلیغ میں یہ

فرماتے ہیں کہ: أنا سيد ولد آدم و لا فخر ، میں تمام اولادِ آدم کا سردار ہوں، اور مجھے فخر نہیں ہے۔ اپنی شان ظاہر کرنے کیلئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے مامور تھے، اس لئے یہ بات ارشاد فرمائی، لیکن تواضع کی شان یہ ہے کہ فرماتے ہیں کہ: لاتفضلونی علیٰ یونس بن متیٰ۔ مجھے یونس بن متیٰ پر فضیلت نہ دو۔ آپ یقیناً افضل تھے لیکن اس تقابل وتفاضل کی کیا ضرورت ہے، یہ آپ کی تواضع تھی، ورنہ دنیا جانتی ہے کہ ایک حضرت یونس علیہ السلام کیا، آپ تو ہر پیغمبر سے افضل ہیں، لیکن آپ نے بطور تواضع کے اپنی تفضیل کو منع فرمایا۔ دیکھئے جو انسانیت میں سب سے بڑا ہے، اس نے ایسی تواضع اختیار کی۔ جب آپ نے مکہ فتح کیا تو یہ وقت ایسا تھا کہ سب سے اونچا آپ کا سر ہوتا، ایک وقت تھا کہ رات کی تاریکی میں آپ مکہ سے نکلے تھے، تین دن تک غارِ ثور میں چھپے رہے، اور ایک وقت یہ آیا ہے کہ آپ دوبارہ مکہ میں فاتحانہ داخل ہو رہے ہیں، یہ وقت تھا کہ آپ کا غلبہ تھا، آپ کی حکومت تھی، اس وقت اگر آپ کی گردن بہت اونچی ہوتی تو ہوسکتا تھا لیکن دیکھنے والوں نے دیکھا کہ آپ اونٹ پر سوار ہیں، ایک جگہ سے نعروں کی یہ آواز سنائی دی، **اليوم يوم الملحمة**، آج لڑائی کا دن ہے، جس کا جی چاہے سامنے آکے دیکھے۔ حضور ﷺ نے دریافت فرمایا، یہ کیسی آواز ہے؟ کون لوگ یہ نعرہ لگا رہے ہیں؟ معلوم ہوا کہ فلاں قافلہ کے سردار یہ نعرہ لگوا رہے ہیں۔ آپ نے انھیں بلوایا اور فرمایا کہ میں نے تم سے یہی کہا ہے؟ تم یہ نعرہ لگاؤ، **اليوم يوم المرحمة**، آج رحمت کا دن ہے، مہربانی کا دن ہے، آج لڑنے کا دن نہیں۔ اور صرف اتنے ہی پر بس نہیں، آپ کو ان کی یہ بات اتنی ناگوار ہوئی کہ آپ نے ان کے ہاتھ سے جھنڈا لے لیا، پھر دیکھنے والوں نے دیکھا کہ آپ اللہ تعالیٰ کی شکر گزاری اور تواضع میں اس قدر جھکے جا رہے ہیں کہ آپ کی پیشانی مبارک اس کجاوے سے لگ گئی جس پر آپ بیٹھے ہوئے تھے۔ اونٹ پر ہی آپ تشریف فرما تھے، لیکن اکڑ کر نہیں، بلکہ آپ کا سر مبارک وہیں سجدہ ریز تھا، اور اس شان سے آپ مکہ میں داخل ہو رہے ہیں۔ یہ تواضع ہے، اس تواضع

کے بعد اللہ تبارک وتعالیٰ کسی کو اٹھاتے ہیں، حدیث شریف میں آیا ہے کہ: مَنْ تَوَاضَعَ لِلّٰہِ رَفَعَہُ اللّٰہُ، جو اللہ کے لئے تواضع اختیار کرتا ہے اللہ تعالیٰ اسے بلند فرماتے ہیں۔ لیکن ہمارے زمانہ کی مصیبت یہی ہے کہ چھوٹا سا بچہ بھی ہوگا تو انتہائی متکبر، وہ بھی اپنے سامنے کسی کو نہیں گردانتا، اور جو بڑا آدمی ہے ظاہر ہے کہ وہ کاہے کو چھوٹا بنے گا، کمتر درجہ کا انسان بھی اپنے کو بڑا سمجھنے کی بیماری میں مبتلا ہے، یہ ایک بہت بڑا مرض ہے، آج جو لوگوں میں آپس میں بگاڑ پھیلا ہوا ہے، اس کی ایک بنیادی وجہ یہ بھی ہے۔

ہمارے حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی علیہ الرحمہ فرمایا کرتے تھے کہ لوگ اتحاد، اتحاد بہت پکارتے ہیں کہ آپس میں اتفاق ہونا چاہئے، اتحاد ہونا چاہئے، لیکن جو اتفاق واتحاد کی جڑ ہے اسے کوئی اختیار نہیں کرتا۔ آپ نے فرمایا کہ اس کی جڑ ہے تواضع، آدمی اپنے کو ہر ایک سے چھوٹا سمجھے تو کسی کی کسی سے لڑائی ہوگی ہی نہیں، لڑائی تو اسی پر ہوتی ہے کہ میں بڑا ہوں، میری بات مان لی جانی چاہئے، اور اگر اپنے کو چھوٹا کہہ دے تو پھر کوئی لڑائی نہیں۔

ہمارے حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے خلاف ایک دشمن نے بہت سازشیں کیں، اس نے دشمنی پس پردہ کی تھی، سامنے کھل کر نہیں کی تھی، آپ جب اس شخص کی بستی میں تشریف لے جاتے تو اس کے دروازے پر ضرور جاتے، اس سے ملتے۔ حضرت مولانا کے معتقدین نے ایک دوسرے بزرگ سے عرض کیا کہ آپ ان کو فلاں شخص کے دروازے پر جانے سے منع کردیجئے، اس نے ان کے خلاف اتنی سازشیں کی ہیں، اور وہ ہیں کہ بار بار ان کے دروازے پر جاتے ہیں، ان بزرگ نے اس بات کو سن کر ٹال دیا، دوبارہ لوگوں نے عرض کیا، آپ نے پھر ٹال دیا، سہ بارہ جب لوگوں نے اصرار کے ساتھ عرض کیا تو انھوں نے فرمایا بھائی! میں ایسے شخص کو کیا منع کروں جو اپنے دل میں یہ سمجھتا ہے کہ دنیا کا سب سے کمتر انسان میں ہوں، مجھ سے گھٹیا کوئی نہیں ہے دنیا کا ہر شخص مجھ سے بدرجہا افضل ہے، جو شخص اپنے کو ایسا خیال کرتا ہو اس سے میں کہا کہوں، وہ تو یہی کہہ دیں گے کہ میں

سب سے بدتر ہوں، یہ لوگ مجھ سے بدرجہا بہتر ہیں پھر میں کیوں نہ ان سے ملوں۔

حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ حدیث کا سبق پڑھا رہے تھے، جب یہ حدیث آئی کہ: لاتفضلونی علیٰ یونس بن متیؑ۔ مجھے یونس بن متیؑ پر فضیلت نہ دو۔ تو طلبہ نے اِشکال کیا کہ حضرت یہ کیسے ہوسکتا ہے، جب حضور ﷺ حضرت یونس علیہ السلام سے افضل تھے، تو آپ یہ کیسے کہہ سکتے تھے کہ مجھے یونس پر فضیلت نہ دو۔ مولانا نے فرمایا بھائی یہ تواضع ہے، کوئی شخص خواہ کتنا ہی بڑا ہو اللہ کی شان اتنی بڑی ہے کہ اس کے سامنے جب اپنے کو دیکھتا ہے تو اپنے کو اس قدر چھوٹا اور حقیر محسوس کرتا ہے کہ اسے اپنی کوئی شان نظر نہیں آتی، خواہ کوئی نبی ہو یا ولی ہو، خدا کی عظمت کا جب استحضار کرتا ہے تو اپنی شان بالکل فنا معلوم ہوتی ہے، یہ نبی کا کمال ہے اور ہر بندے کا کمال یہی ہے کہ خدا کے سامنے اپنے کو اتنا پست کردے کہ اس سے زیادہ پستی کا تصور بھی نہ ہوسکے، تو فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ کے پیش نظر اللہ تعالیٰ کی عظمت تھی، اس عظمت کے سامنے آپ کو اپنی کوئی حقیقت نظر نہیں آتی تھی، یہ تو کمال تھا اور یہ تواضع تھی۔ طلبہ کی سمجھ میں یہ بات نہیں آئی، جب آپ افضل تھے تو کیونکر اس کو منع کرسکتے ہیں، آپ نے سمجھایا کہ بھائی یہ مطلق تواضع ہے، چونکہ خدا کی عظمت پیش نظر تھی اس لئے اپنی کوئی حقیقت نظر نہیں آتی تھی، ایسی حالت میں بھلا دوسروں کے اوپر اپنی افضلیت ثابت کرنے کی اجازت کیسے دیں گے، لیکن طلبہ اِشکال پر اِشکال کرتے رہے یہاں تک کہ اس دن کا سبق اسی اِشکال میں چلا گیا، جب حضرت نے دیکھا کہ سبق کا وقت ختم ہورہا ہے تو فرمایا کہ اچھا میاں! ایک بات بتاؤ کہ تم لوگ مجھے کیسا سمجھتے ہو؟ طلبہ حضرت کا مقصد نہ سمجھے، کہنے لگے حضرت ہم آپ کو اللہ کا ولی، انتہائی بزرگ اور زبردست متبحر عالم دین سمجھتے ہیں، ارشاد فرمایا اچھا یہ بتاؤ مجھے سچا بھی سمجھتے ہو یا نہیں؟ کہنے لگے حضرت جب ہم نے آپ کو اولیاء اللہ میں مان لیا تو آپ کو جھوٹا سمجھنے کا کیا معنی، ہم بالکل سچا سمجھتے ہیں۔ فرمایا جو کہوں گا اسے مانو گے، عرض کیا بالکل۔ فرمایا میں خدا کی قسم کھا کر

کہتا ہوں کہ تم میں سے ہر ہر فرد کو اپنے سے ہزار درجہ افضل سمجھتا ہوں، آپ نے یہ بات کچھ اس انداز سے ارشاد فرمائی کہ تمام طلبہ بے تاب ہو گئے، ان کی چیخیں بلند ہو گئیں، بعض تو روتے روتے بیہوش ہو گئے، اور آپ اتنا فرما کر فوراً حجرہ میں تشریف لے گئے۔ دوسرے دن مولانا نے سبق میں فرمایا کہ کہو بھئی بات سمجھ میں آ گئی، طلبہ نے عرض کیا حضرت بالکل سمجھ گئے، بات یہی ہے جو آدمی جتنا بڑا ہوتا ہے اس کی بڑائی کی دلیل یہی ہے کہ وہ اپنے کو چھوٹا سمجھتا ہے، اور جو آدمی اپنے کو بڑا سمجھتا ہے تو یہی بات اس کے چھوٹے اور کمینہ ہونے کی دلیل ہے کہ وہ اس پندار میں مبتلا ہے کہ میں بڑا ہوں۔

اس سلسلے میں تکبر کے متعلق چاہتا ہوں کہ چند روایتیں پیش کر دوں، حضرت عمر ؓ کی روایت ہے: عن عمر قال وهو على المنبر، حضرت عمر ؓ منبر پر کھڑے ہو کر ارشاد فرما رہے تھے: يا أيها الناس تواضعوا! اے لوگو تواضع اختیار کرو، پستی اختیار کرو، فإني سمعت رسول الله ﷺ يقول، میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا ہے کہ: مَنْ تَوَاضَعَ لِلّٰهِ رَفَعَهُ اللّٰهُ، جو اللہ کے لئے تواضع کرتا ہے، پستی اختیار کرتا ہے یعنی اللہ کی عظمت اور اس کی کبریائی کے سامنے اپنے کو بالکل ذلیل اور فنا سمجھتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسے بلند فرماتے ہیں۔ اب سنئے اس کے بعد والا جملہ قابل غور ہے، فرماتے ہیں: فهو في نفسه صغير وفي أعين الناس عظيم، وہ اپنے نزدیک تو بہت ذلیل و حقیر ہوتا ہے لیکن لوگوں کی نگاہ میں بہت بڑا ہوتا ہے، اور یہ حقیقت ہے کہ جو شخص اپنے کو چھوٹا اور ذلیل خیال کرتا ہے لوگوں کی نگاہ میں اس کی عظمت جم جاتی ہے، اور اسی کے مقابلے میں رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: **ومن تكبر** اور جو تکبر اختیار کرتا ہے، اور اپنے کو بڑا سمجھتا ہے اور بنتا ہے، **وضعه الله**، اس کو اللہ تعالیٰ گرا دیتے ہیں، پست کر دیتے ہیں، تو حال یہ ہوتا ہے کہ فهو في أعين الناس صغير وفي نفسه كبير، وہ اپنے نزدیک تو بہت بڑا ہے، سمجھتا ہے کہ میں سب سے بڑھ کر ہوں، اور دوسروں کے نزدیک انتہائی پست اور ذلیل ہوتا ہے، اور یہ

مشاہدہ کی بات ہے کہ جب کوئی شخص اپنی بڑائی ہانکتا ہے، ڈینگ مارتا ہے تو سننے والا اس وقت تو چاہے سن لے، مگر پیچھے یہی کہتا ہے کہ بڑا کمینہ انسان ہے، دیکھو تو کیسی شیخی بگھار رہا تھا، یہ انسان کی فطرت میں ہے کہ متکبر کو وہ ذلیل وکمینہ سمجھتا ہے۔ اب آگے رسول اللہ ﷺ کا ارشاد سنئے! فرماتے ہیں: حتیٰ لھو أھون علیھم من کلبٍ او خنزیرٍ، یہاں تک کہ وہ ولوگوں کے نزدیک کتے اور خنزیر سے بھی زیادہ ذلیل ہوتا ہے۔ یعنی لوگ کتے اور خنزیر کو کچھ سمجھیں گے، لیکن اس متکبر کو کوئی درجہ دینے کے لئے تیار نہ ہوں گے۔ انتہائی ذلیل ہوتا ہے وہ انسان جو اپنے کو بڑا سمجھتا ہے، اسے خیال ہوتا ہے کہ میری بڑائی قائم رہنی چاہئے، تو دیکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کیسا اسے ذلیل ورُسوا کر رہے ہیں، اور یہ جو اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: **تِلْکَ الْدَّار الْآخِرَۃُ نَجْعَلُھَا لِلَّذِیْنَ لَایُرِیْدُوْنَ عُلُوّاً فِی الْاَرْضِ وَلَافَسَاداً**۔ یہ عالم آخرت ہم ان لوگوں کے لئے خاص کرتے ہیں جو دنیا میں تکبر نہیں کرتے اور فساد نہیں مچاتے، تو اس کی شرح حدیث سے سنئے!

رسول اللہ ﷺ ارشاد فرماتے ہیں: ألا أخبرکم بأھل الجنۃ، میں اہل جنت کے متعلق بتادوں کہ وہ کون لوگ ہیں؟ صحابہ نے عرض کیا ضرور یا رسول اللہ! فرماتے ہیں: کل ضعیفٍ مستضعفٍ، ہر وہ انسان جو کمزور ہو اور لوگ بھی اسے کمزور سمجھتے ہوں، نیک ہو، دیندار ہو، پرہیزگار ہو، لیکن اس کی عظمت لوگوں کے دلوں میں نہ ہو، اور خود بھی اپنے کو چھوٹا ہی سمجھتا ہو، وہ جنت میں جائے گا۔ اس کی نیکی، اس کی تواضع کی وجہ سے اللہ کے یہاں اس کی عظمت کا یہ حال ہے کہ: لو أقسم علی اللہ لأبرہ یعنی اگر وہ اللہ کے اوپر کسی بات کی قسم کھا بیٹھے کہ ایسا ضرور ہوگا تو اللہ تعالیٰ اسے پورا کر دیں گے، ہے وہ کمزور آدمی لیکن خدا کے نزدیک اس کا مقام وہ ہے کہ خدا اس کی قسم پوری فرماتے ہیں۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ ان کی پھوپھی نے کسی باندی کو مار دیا اور اس کا دانت ٹوٹ گیا، باندی کے مالکوں نے رسول اللہ ﷺ کے پاس دعویٰ کیا، آپ نے فیصلہ فرمایا کہ قصاص واجب ہے

، جب اس نے دانت توڑا ہے تو اس کا بھی دانت توڑا جائے گا، حضرت انس کی پھوپھی کے گھر والوں نے چاہا کہ کچھ دے کر صلح کر لی جائے، لیکن باندی کے مالک تیار نہیں ہوئے، آپ نے فرمایا کہ جب یہ لوگ دیت لینے پر آمادہ نہیں ہیں تو دانت توڑا جانا یقینی ہے، حضرت انس کے چچا نضر بن انس کہنے لگے کہ خدا کی قسم میری بہن کے دانت نہیں ٹوٹیں گے، حضرت نے فرمایا کہ تم کیا کہہ رہے ہو، انھوں نے پھر یہی بات دہرائی، ان کا منشا معارضہ کرنا نہیں تھا بلکہ اللہ پر اعتماد کرتے ہوئے یہ سمجھ رہے تھے کہ یہ لوگ صلح کر لیں گے، چنانچہ ایسا ہی ہوا، وہ لوگ رقم لے کر صلح پر راضی ہوگئے، اس پر آپ نے ارشاد فرمایا کہ اللہ کے کچھ بندے ایسے بھی ہوتے ہیں کہ اللہ کے اوپر قسم کھالیں تو خدا ان کی قسم کی لاج رکھ لیتے ہیں، یہی مطلب ہے لو أقسم علی الله لأبره کا۔ پھر اس کے مقابلے میں فرمایا: ألا أخبركم بأهل النار ، میں تمھیں یہ نہ بتادوں کہ اہل جہنم کون ہیں؟ کل عتل جواظ مستكبر ، عتل کہتے ہیں سخت دل انسان کو، جس کا دل پسیجتا نہ ہو، اور اس میں نرمی نہ آتی ہو، جوّاظ متکبر انسان جو اکڑ کر چلتا ہو، اور متکبر یعنی تکبر کرنے والا یعنی سخت دل اکڑنے والا متکبر، ایسا شخص جہنم میں جائے گا، جنت سے محروم ہوگا۔

دوسری حدیث میں رسول اللہ ﷺ ارشاد فرماتے ہیں کہ: لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ مَنْ كَانَ فِي قَلْبِهِ مِثْقَالُ ذَرَّةٍ مِنْ كِبْرٍ ، وہ شخص جنت سے محروم ہوگا جس کے دل میں ایک ذرہ تکبر کا حصہ ہوگا، وہ جہنمی ہے، یہ سن کر حضراتِ صحابہ کو پریشانی ہوئی، جس شخص کے دل میں خوفِ خدا اور خوفِ آخرت ہوگا وہ اس جیسی بات کو سن کر کانپ ہی جائے گا۔ راوی کا بیان ہے کہ فَقَالَ رَجُلٌ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ اِنَّ الرَّجُلَ يُحِبُّ اَنْ يَكُوْنَ ثَوْبُهٗ حَسَنًا وَ نَعْلُهٗ حَسَنًا ، کوئی آدمی ایسا ہوتا ہے کہ وہ اچھا کپڑا اور اچھا جوتا پہننا پسند کرتا ہے، تو یہ بھی کبر ہے، فرمایا کہ اِنَّ اللّٰهَ جَمِيْلٌ يُحِبُّ الْجَمَالَ، اللہ تو خود جمیل ہیں اور جمال کو پسند فرماتے ہیں، اگر کوئی شخص اچھا لباس پہننا چاہتا ہے تو خدا کو یہ بات ناپسند نہیں ہے، پھر کبر کسے کہتے ہیں؟

رسول اللہ ﷺ نے اس کی تشریح فرمائی: اَلْکِبْرُ بَطَرُ الْحَقِّ وَغَمْطُ النَّاس ، کبر یہ ہے کہ حق بات سامنے آئے، اللہ اور اس کے رسول کا ارشاد آدمی سنے، شریعت کا حکم اسے معلوم ہو اور اپنی خواہش کے خلاف ہونے کی وجہ سے، اپنی سوسائٹی کے خلاف ہونے کی وجہ سے، اپنے رسم ورواج کے خلاف ہونے کی وجہ سے اس کا انکار کرے، اس سے اعراض کرے، اللہ اور رسول کی جانب سے کوئی فیصلہ صادر ہو لیکن آدمی کو اس میں اپنی بے عزتی معلوم ہو، سمجھتا ہو کہ اگر یہ فیصلہ تسلیم کرلوں تو سوسائٹی میں میری توہین ہوگی، میری ذلت ہوگی، یہ سوچ کر اللہ اور اس کے رسول کی بات سے اعراض کرتا ہے، اس کا انکار کردیتا ہے، یہ تکبر ہے۔ ایسا بہت ہوتا ہے کہ جب کسی کا کسی سے نزاع ہوجاتا ہے تو وہ شخص دوسرے سے دبنا نہیں چاہتا، معاملات میں جھگڑنے والے اوّل تو اللہ اور رسول کا حکم ہی نہیں معلوم کرتے، اور اگر کسی مفتی سے مسئلہ پوچھا بھی تو جس کے موافق ہوتا ہے تو وہ مان لیتا ہے لیکن جس کے خلاف وہ فتویٰ پڑتا ہے وہ ہزار تاویل اور ہزار بہانے کرکے اس سے اعراض وانکار کی راہ اختیار کرتا ہے، اسی کا نام بطر الحق، حق بات سامنے آئی مگر آدمی اس سے بچنے کیلئے بہانے تلاش کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں کہ: فَلاَوَرَبِّکَ لَایُوْمِنُوْنَ حَتّٰی یُحَکِّمُوْکَ فِیْمَا شَجَرَ بَیْنَھُمْ ثُمَّ لَایَجِدُوْا فِیْ أَنْفُسِھِمْ حَرَجاً مِّمَّاقَضَیْتَ وَیُسَلِّمُوْا تَسْلِیْماً، قسم ہے تمہارے پروردگار کی یہ لوگ اس وقت تک مومن نہ ہوں گے جب تک کہ اپنے جھگڑوں کے اندر آپ کو فیصل نہ بنائیں، یعنی ان کے درمیان کسی بات پر اختلاف ہو اور یہ لوگ اس کا فیصلہ تمہارے پاس نہ لاویں، اللہ اور اس کے رسول کے علاوہ کسی اور کے پاس معاملہ لے جائیں تو یہ لوگ مومن نہیں ہیں۔

مومن وہی ہوگا جو اپنے کو اللہ اور رسول کے فیصلے پر ڈال دے، مدینہ میں کچھ منافقین بھی رہتے تھے، وہ یہی حرکت کرتے تھے، ان کا کسی سے اختلاف ہوتا تو رسول اللہ ﷺ کے پاس آنے سے گھبراتے تھے، وہ سوچتے تھے کہ آپ کے پاس معاملہ جائے گا تو حق

کے مطابق فیصلہ ہوگا اور حق ہمارے خلاف ہے، لہٰذا فیصلہ ہمارے خلاف ہوگا اور ہماری رُسوائی ہوگی، اسی لئے آپ کے پاس نہیں آتے تھے، بلکہ یہود کے پاس چلے جاتے تھے۔ ایک یہودی اور ایک منافق جو خود کو مومن ظاہر کرتا تھا، دونوں کے درمیان کسی بات پر نزاع ہوئی، یہودی نے کہا کہ اس کا فیصلہ اپنے نبی سے کرالو مگر منافق کہنے لگا کہ نہیں اپنے سردار کعب بن اشرف کے پاس چلو، یہودی سمجھتا تھا کہ کعب بن اشرف خود نہایت ظالم شخص ہے، اس کا فیصلہ بھی ظالمانہ ہوگا، اور رسول اللہ ﷺ کے اوپر گو کہ اس کا ایمان نہیں تھا لیکن اسے یقین تھا اور اپنی کتاب میں پڑھ رکھا تھا کہ آپ فیصلہ حق کے مطابق کریں گے، اس معاملہ میں حق یہودی کے ساتھ تھا، تھوڑی دیر تکرار ہوتی رہی، بالآخر وہ منافق بھی آپ کے پاس آنے پر رضامند ہوگیا، اپنے کو مومن ظاہر کرتا تھا، آخر صراحتاً انکار کیسے کردیتا، آپ نے دونوں کا معاملہ سنا اور یہودی کے حق میں فیصلہ کردیا۔ منافق کو اطمینان نہیں ہوا، کہنے لگا چلو ذرا ابوبکر کے پاس بھی، ان سے بھی ذرا معاملہ سمجھ لیں، یہودی نے کہا جب یہاں فیصلہ ہوگیا تو اب کہیں جانے کی کیا ضرورت ہے؟ منافق نے اصرار کیا، سوچا کہ شاید وہاں کچھ گنجائش نکل آئے، ابوبکر (رضی اللہ عنہ) تو نبوت کا آئینہ تھا، جو نور آپ کے قلب پر نازل ہوتا، اس کا عکس ابوبکر کے دل پر بھی چمک جاتا، انھوں نے بعینہٖ وہی الفاظ کہے جو حضور ﷺ نے ارشاد فرمائے تھے، یہاں بھی منافق کو ناکامی ہوئی، کہنے لگا کہ چلو عمر (رضی اللہ عنہ) کے پاس، اس نے سوچا کہ عمر سخت آدمی ہیں، حدیث میں آتا ہے کہ: **وأشدهم فی أمر الله عمر** ، اللہ کے امر میں عمر سخت ہیں، عمر بھی مسلمان ہیں اور مجھے بھی وہ مسلمان جانتے ہیں، یقیناً وہ ایک مسلمان کی طرفداری کریں گے، یہودی وہاں جانے پر بھی رضامند ہوگیا، حضرت عمر کے پاس پہونچے، حضرت عمر کو بلایا، وہ اندر سے نکلے، پوچھا کہ کیا معاملہ ہے؟ معاملہ ان کے سامنے رکھا گیا، پھر یہودی کہنے لگا کہ حضور فیصلہ کرنے سے پہلے ایک بات سن لیجئے، ہم اس معاملہ کو لے کر آپ کے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پاس گئے تھے، انھوں نے یہ فیصلہ کیا، اس پر

اسے اطمینان نہیں ہوا تو یہ شخص ابو بکر کے پاس گیا، انھوں نے بھی یہی فیصلہ کیا، اب بھی اس کو اطمینان نہیں ہوا تو آپ کے پاس آیا ہے، حضرت عمر نے اس سے پوچھا کہ یہی بات ہے، اس نے اقرار کیا، آپ نے فرمایا اچھا ٹھہرو میں ابھی آتا ہوں، یہ کہہ کر اندر تشریف لے گئے، اور تلوار لے کر باہر آئے اور اس منافق کی گردن اُڑا دی، اور فرمایا کہ جو اللہ اور رسول کے فیصلے پر راضی نہ ہو اس کا فیصلہ یہی ہے، اللہ کے رسول نے اس کا کوئی نوٹس نہیں لیا کہ عمر نے ایک مسلمان کو کیوں قتل کر دیا۔ **فَلَا وَرَبِّکَ لَا یُؤْمِنُوْنَ حَتّٰی یُحَکِّمُوْکَ فِیْمَا شَجَرَ بَیْنَهُمَ** قسم ہے تمہارے پروردگار کی یہ لوگ اس وقت تک مومن نہ ہوں گے جب تک کہ اپنے جھگڑوں کا فیصلہ تمہارے پاس نہ لاویں، **ثُمَّ لَا یَجِدُوْا فِیْ أَنْفُسِهِمْ حَرَجاً مِّمَّا قَضَیْتَ**، پھر جو فیصلہ تم کر دو اس کے متعلق اپنے دل میں کوئی تنگی اور گرانی محسوس نہ کریں، بلکہ **وَیُسَلِّمُوْا تَسْلِیْماً**، پوری خوشنودی اور خوشدلی کے ساتھ اسے قبول کر لیں، اگر گرانی محسوس کی تو اس کے ایمان میں نقص ہے، تو مومن کامل اس وقت ہوگا جبکہ اپنے ہر ہر معاملہ کو اللہ اور رسول کے سامنے پیش کر کے اور جو وہاں سے فیصلہ ہو اس پر اپنے دل میں کوئی گرانی محسوس نہ کرے، بلکہ پوری خوش دلی کے ساتھ قبول کر لے، اور اگر اللہ و رسول کے فیصلے میں بظاہر کچھ نقصان معلوم ہوتا ہو تو وہ یہ کہہ کر اپنے دل کو مطمئن کر دے کہ اللہ و رسول کے فیصلے میں چاہے ظاہراً کچھ نقصان معلوم ہوتا ہو لیکن حقیقتاً فائدہ ہی فائدہ ہے۔

صحابہ کرام میں یہی بات تھی کہ تکبر سے وہ بچ گئے تھے، یہی حضرت عمر ؓ جنھوں نے یہ فیصلہ کیا تھا، جب صلح حدیبیہ ہوئی تھی باوجودیکہ مسلمان اس وقت بہت طاقتور تھے، لیکن صلح بہت دب کر ہوئی تھی، کفار نے یہ شرط رکھی تھی کہ ہمارا کوئی آدمی مکہ سے مسلمان ہو کر مدینہ چلا آوے گا تو آپ کو واپس کرنا پڑے گا، اور آپ کا کوئی آدمی مدینہ سے مکہ آجائے گا تو ہم واپس نہیں کریں گے، بات بالکل اُلٹی تھی، ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ مکہ سے کوئی آتا تو واپس نہ کیا جاتا، اور مدینہ سے کوئی جاتا تو واپس کر دیا جاتا، اس وقت مسلمان طاقتور

تھے، کمزور نہ تھے، لیکن شرط ایسی رکھی جارہی ہے اور رسول اللہ ﷺ تصدیق فرمارہے ہیں، اور اسے منظوری دے رہے ہیں۔ یہ دفعہ اتنی سخت تھی کہ حضراتِ صحابہ بے چین ہوگئے، اسی دوران جبکہ یہ صلح نامہ مکمل ہوا تھا، حضرت ابوجندلؓ ایک صحابی ہیں، مکہ میں کفار کی قید میں تھے، وہ کسی طرح بھاگ کر مسلمانوں کے لشکر میں آگئے، لوگوں کو اپنی پیٹھ کھول کر دکھائی کفار نے مار مار کر لہولہان کررکھا تھا، اور کہنے لگے کہ کیا مجھے پھر کفار کے پاس بھیجا جائے گا، سخت مصیبت میں تھے، تمام مسلمانوں کی آنکھوں میں خون اتر آیا، کوئی شخص یہ نہیں چاہتا تھا کہ یہ پھر مکہ واپس بھیجے جائیں۔ رسول اللہ ﷺ کے پاس لوگوں نے عرض کیا کہ اس صورتحال میں اگر انھیں واپس بھیج دیا جائے تو کفار انھیں مار کر قتل ہی کرڈالیں گے، لیکن ابوجندل کا باپ جو صلح نامہ لکھوارہا تھا وہاں موجود تھا، اس نے کہا محمد آپ کو صلح نامہ کی پابندی کرنی ہوگی۔ رسول اللہ ﷺ نے ابوجندل کو سمجھایا جاؤ، ہمارا عہد نامہ چونکہ مکمل ہو چکا ہے، اس لئے ہم مجبور ہیں اور ہم نے جو وعدہ کرلیا ہے اس کے خلاف ہم نہیں کرسکتے، جاؤ اللہ تعالیٰ تمہارے حق میں خیر فرمائیں گے، اللہ تعالیٰ تمہاری مدد فرمائیں گے، اب یہ ابوجندل کے ایمان کا کمال تھا اور انھیں کا دل گردہ تھا کہ واپس چلے گئے، اور صحابہ کرام کا بھی کمال تھا کہ انھیں واپس کردیا اور کسی نے رسول اللہ ﷺ پر کوئی اِشکال نہیں کیا، ہمارا دور ہوتا تو اپنے سردار پر ہی ہم اشکال شروع کردیتے کہ صاحب! یہ کیسا صلح نامہ ہے، ہم نہیں مانتے، یہ صحابہ کرام کا ایمان تھا کہ چاہے کچھ ہوجائے، چاہے ابوجندل کی جان چلی جائے، لیکن عہد نامہ مکمل ہوچکا ہے، رسول اللہ ﷺ کی بات ٹالی نہیں جاسکتی، حضرت عمرؓ کے ایمان میں کوئی کمی نہیں تھی ایمان ان کا کامل تھا، لیکن بشریت کے تقاضے سے بیتاب تھے کہ طاقتور ہوتے ہوئے اس قدر دب کر کیوں صلح کی گئی، گھبرا کر رسول اللہ ﷺ کے پاس حاضر ہوئے اور عرض کیا یا رسول اللہ! کیا ہم حق پر نہیں ہیں، آپ نے فرمایا کیوں نہیں بیشک، عرض کیا، کیا ہمیں طاقت حاصل نہیں ہے، آپ نے فرمایا وہ بھی حاصل ہے، عرض کیا، پھر اسقدر دب کر

کیوں صلح ہوئی۔ آپ نے فرمایا عمر کیا تم اللہ اور اس کے رسول کے فیصلے پر راضی نہیں ہو، حضرت عمر وہاں سے چلے آئے، لیکن بشری بے قراری دل میں موجود تھی، حضرت ابوبکر کے پاس آئے، اور وہاں بھی یہی سوال و جواب ہوا، انھوں نے بھی یہی کہا کہ عمر کیا تم اللہ اور رسول کے فیصلے پر راضی نہیں ہو، وہ زیادہ بہتر جانتے ہیں، حضرت عمر فرماتے ہیں کہ بعد میں مجھے خیال ہوا کہ عمر کو کیا حق تھا رسول اللہ ﷺ پر اِشکال کرنے کا، ایمان تو کامل تھا لیکن ایک فطری بے چینی و بے تابی تھی، جس نے حضرت عمر سے یہ سب کہلوایا۔ اب تو بہت شرمندگی ہوئی، جب مسلمانوں کا قافلہ وہاں سے کوچ کر کے چلا ہے تو حضرت عمر کا گھوڑا سب سے پیچھے تھا، حالانکہ حضرت عمر عموماً رسول اللہ ﷺ کے ساتھ چلا کرتے تھے، لیکن آج وہ سب سے پیچھے تھے، اس ڈر سے کہ کہیں ان کے خلاف خدا کی جانب سے وحی نہ نازل ہوجائے، اور یہ کہہ دیا جائے کہ عمر منافق ہے، اتنا جری اور بہادر آدمی آج اس ڈر سے پیچھے چل رہا ہے، رسول اللہ ﷺ آگے تشریف لے جارہے تھے، راستہ میں آپ کے اوپر وحی کا نزول ہوا، اس میں بشارت دی گئی کہ إِنَّا فَتَحْنَا لَکَ فَتْحاً مُّبِیْناً، یہ صلح جسے لوگ دبی ہوئی صلح سمجھ رہے ہیں، یہ درحقیقت فتح مبین ہے، رسول اللہ ﷺ کو جب وحی سے اِفاقہ ہوا تو آپ نے فوراً پکارا کہ عمر کہاں ہیں؟ حضرت عمر فرماتے ہیں کہ میرے کان میں جب حضور کی یہ آواز آئی تو میں اور پیچھے چلا گیا، مجھے اندیشہ ہوا کہ یہ وحی میرے ہی متعلق نازل ہوئی ہے، لوگ دوڑے، حضرت عمر سے کہا گیا کہ آپ کا بلاوا ہورہا ہے، حضرت عمر فرماتے ہیں کہ میرا دل خوف سے کانپ گیا، لیکن بالآخر ڈرتے ہوئے کانپتے ہوئے حضور کی خدمت میں حاضر ہوا، جب پاس پہونچا تو حضور مسکرارہے تھے، یہ انداز دیکھ کر جان میں جان آئی، اور میں سمجھ گیا کہ معاملہ وہ نہیں ہے جس کا مجھے ڈر تھا، پھر آپ نے مجھے وہ آیت سنائی جو ابھی نازل ہوئی تھی یعنی إِنَّا فَتَحْنَا لَکَ فَتْحاً مُّبِیْناً، اور میں تو سمجھتا ہی تھا کہ اللہ کے رسول کا فیصلہ برحق ہوتا ہے، یہ تو مجھ سے غلطی ہوگئی تھی۔ ایمان والے ہیں کہ ہزاران کی طبیعت کے

خلاف کوئی بات ہو، مگر بات وہی مانیں گے جو خدا کی طرف سے ہو اسی صلح میں دیکھئے کہ کیسی ذلت کی شرط معلوم ہو رہی تھی، لیکن اس ذلت کی کوئی پروا نہیں کی، آج بھی یہی بات ہے کہ جب کوئی مسئلہ ہو تو مومن کا یہی کام ہے کہ اللہ اور رسول کے حوالے کر دے اور جو وہاں سے فیصلہ ہو خوش دلی کے ساتھ اسے قبول کر لے چاہے اس کے نفس کے خلاف پڑے یا موافق ۔ آج ہماری یہ بیماری ہے کہ اگر کسی معاملہ میں ہم یہ سمجھیں گے کہ اللہ و رسول کا فیصلہ ہمارے موافق ہوگا تو فتویٰ لینے جائیں گے ورنہ نہیں، اگر ہماری مرضی کے خلاف فتویٰ آ گیا تو اس میں بہانے تلاش کریں گے، اس میں تاویلیں کریں گے، یہ بات ایمان کے خلاف ہے۔ **فَلَاوَرَبِّکَ لَایُوْمِنُوْنَ حَتّٰی یُحَکِّمُوْکَ فِیْمَا شَجَرَ بَیْنَهُمْ ثُمَّ لَایَجِدُوْا فِیْٓ أَنْفُسِهِمْ حَرَجاً مِّمَّاقَضَیْتَ وَیُسَلِّمُوْا تَسْلِیْماً** ، قسم ہے تمہارے پروردگار کی یہ لوگ اس وقت تک مومن نہ ہوں گے جب تک کہ اپنے معاملات میں فیصلہ تمہارے سپرد نہ کریں، اور پھر تمہارے فیصلہ کو خوش دلی کے ساتھ قبول نہ کر لیں۔

یہاں دو بات ہے، ایک تو یہ کہ فیصل تمہیں بنائیں، دوسرے یہ کہ پھر اس فیصلہ پر کوئی گرانی نہ محسوس کریں۔ تو آپ فرماتے ہیں: **بطر الحق** ، تکبر کیا ہے؟ حق کا انکار کرنا۔ حق بات آ جائے تو اپنی تحقیر و توہین اور ذلت و رسوائی کے اندیشہ سے اس کا انکار کر دے، اس کا نام تکبر ہے، ایک بات تو یہ ہے، اور دوسری بات آپ نے ارشاد فرمائی کہ **وغمط الناس** ، اور لوگوں کو حقیر سمجھنا، دوسروں کو اپنے مقابلے میں چھوٹا سمجھنا، اور اپنے کو بڑا سمجھنا۔ گویا تکبر دو باتوں کا نام ہے، ایک تو حق بات کا انکار کرنا، اور دوسرے اپنے مقابلے میں اوروں کو حقیر سمجھنا، جس میں یہ دونوں باتیں ہوں یا دونوں میں سے ایک بات ہوگی وہ جنت میں نہ جائے گا۔

یُحْشَرُ الْمُتَکَبِّرُوْنَ أَمْثَالَ الذَّرِّ یَوْمَ الْقِیَامَةِ **قیامت کے دن متکبرین چیونٹیوں کے مثل اٹھائے جائیں گے**، یعنی ان کا جسم چیونٹیوں کے برابر ہوگا، فِی صُوْرَةِ الرِّجَالِ

صورت آدمیوں ہی کی ہوگی، رہیں گے آدمی ہی، ناک نقشہ آدمیوں جیسا ہوگا، یَغْشَاهُمُ الذُّلُّ مِنْ كُلِّ مَكَان چاروں طرف سے ان پر ذلت چھائی ہوگی، يُسَاقُونَ إِلىٰ سِجْنٍ فِي جَهَنَّمَ جہنم کے قیدخانہ کی جانب انھیں ہنکایا جائے گا، يُسَمّىٰ بَوْلَسَ اس قیدخانہ کا نام بولس ہوگا، مایوسی کا گھر، جس میں آدمی کو کسی قسم کی امید نہ ہو، ہر چیز سے ناامید ہو، تَعْلُوْهُمْ نَارُالْاَنْيَارِ سب سے بڑی آگ ان پر بلند ہورہی ہوگی، یہ تو آگ کی بات ہے، اور کھانے پینے کو کیا دیا جائے گا؟ فرماتے ہیں: يُسْقَوْنَ مِنْ عُصَارَةِ أَهْلِ النَّارِ طِيْنَةِ الْخِبَالِ، جہنمیوں کے بدن سے خون اور پیپ اور کچ لہو جو بہتا ہوگا نہایت گرم کر کے وہی پلایا جائے گا۔ احادیث میں طينة الخبال پلانے کے بارے میں دو آدمیوں کو بتلایا گیا ہے، دو آدمیوں کو طينة الخبال یعنی جہنمیوں کے بدن کا خون اور پیپ پلایا جائے گا۔ ایک متکبر اور دوسرے شرابی، جو شخص شراب پیتا ہے حدیث شریف میں ہے کہ میرے رب نے قسم کھائی ہے کہ شراب پینے والے کو طينة الخبال پلا کر رہوں گا، جو شخص شراب کا یا کسی بھی نشہ کا عادی ہوگا وہ طينة الخبال سے بچ نہیں سکتا، بعض دوسری روایتوں سے پتہ چلتا ہے کہ جہنمیوں کا مشروب اتنا گرم ہوگا کہ اول تو جہنمی اسے پینا ہی نہ چاہے گا لیکن پینے پر مجبور کیا جائے گا، وہاں تو فرشتے مسلط ہوں گے اور جب پئے گا تو شدت حرارت کی وجہ سے آنتیں کٹ کٹ کر پاخانہ کے راستے سے باہر نکل پڑیں گی۔ دیکھتے ہیں تکبر کی سزا کتنی سخت ہے؟ پھر اسی تکبر کے انڈے بچے غصہ کی صورت میں ظاہر ہوتے ہیں، متکبر انسان غصہ ور بھی ضرور ہوگا۔ سب سے پہلا متکبر کون تھا؟ ابلیس تھا، جس نے آدم علیہ السلام کے مقابلے میں تکبر کیا تھا، اب جو بھی تکبر کرتا ہے وہ شیطان کی خصلت لیتا ہے، پھر غصہ بھی اسے آتا ہے، حدیث شریف میں آتا ہے: إن الغضب من الشيطان، غصہ شیطان کی وجہ سے آتا ہے، وإن الشيطان خلق من النار، اور شیطان آگ سے پیدا کیا گیا ہے، وإنما النار تطفأ بالماء، اور آگ پانی سے بجھائی جاتی ہے، فإذا غضب أحدكم فليتوضأ، پس جب کسی

کو غصہ آئے تو وضو کر لے۔ وضو کرنے سے آگ بجھ جائے گی، اور غصہ ٹھنڈا ہو جائے گا۔

تکبر کے بارے میں حدیث میں بہت کچھ آیا ہے، اگر آدمی رسول اللہ ﷺ کے ان ارشادات پر غور کر لے تو تکبر کو تھوک دے گا، یہ ایسی چیز نہیں ہے کہ کسی مومن کے دل میں رہے۔

حضرت اسماء بنت عمیس **رضی اللہ عنہا** کی روایت ہے، فرماتی ہیں کہ سمعت رسول اللہ ﷺ یقول بئس العبد عبد تخیل و اختال، برا ہے وہ بندہ جو تکبر کرے اور اکڑے، و نسی الکبیر المتعال، اور اللہ کو بھول جائے جو بڑا اور اعلیٰ ہے۔ اللہ جو سب سے بڑا ہے، اور سب سے بلند ہے اسے بھول کر جو تکبر کرتا ہے وہ بہت ہی برا بندہ ہے، اور سوچئے یہ کتنی بری بات ہے کہ آدمی اپنے بڑے کے سامنے ہی اپنی بڑائی ہانکے، باپ کے ہوتے ہوئے اس کے سامنے کوئی بیٹا اپنے کو بڑا ظاہر کرے تو باپ کو کتنا ناگوار ہوتا ہے۔ شیخ سعدی نے گلستاں میں ایک واقعہ لکھا ہے کہ ایک گاؤں میں کوئی چودھری تھا، سب گاؤں والے اس کی تعظیم کرتے تھے، اس کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑے رہتے تھے، سب اس سے ڈرتے تھے، اتفاقاً ایک بار ادھر سے تحصیل دار آ نکلا، اب تو یہ چودھری صاحب اس کے سامنے ہاتھ باندھے تھر تھر کانپ رہے تھے، اس کے بیٹے نے باپ کی جو یہ حالت دیکھی تو اسے بہت تعجب ہوا، تحصیل دار کے جانے کے بعد اس نے باپ سے پوچھا کہ ابا جان ہمیشہ تو لوگ آپ کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑے ہوتے تھے اور آپ سے ڈرتے تھے، آج آپ کو کیا ہو گیا تھا کہ آپ خود اس شخص کے سامنے ہاتھ باندھے کانپ رہے تھے، اس نے کہا کہ گاؤں کے سب لوگ مجھ سے چھوٹے ہیں، اس لئے وہ میرے سامنے تعظیم سے کھڑے ہوتے ہیں، یہ تحصیلدار صاحب مجھ سے بڑے ہیں، اس لئے ان کے سامنے میری سب بڑائی فنا ہو گئی تھی، اب ان کے ہوتے ہوئے مجھے بڑائی ہرگز زیب نہیں دیتی، اور اگر میں اپنی بڑائی ظاہر کرتا تو سزا ہو جاتی، اگر بڑے کے سامنے کوئی بڑائی ظاہر کرتا ہے تو اس پر

مولانا روم کی بیان کردہ ایک مثال صادق آتی ہے۔ مولانا روم کو واقعات اور مثالوں سے مسائل حل کرنے کا بڑا ملکہ حاصل ہے، انھوں نے ایک تمثیلی واقعہ لکھا ہے کہ ایک شیر ایک بھیڑیا اور ایک لومڑی تینوں میں ایک مرتبہ دوستی ہوگئی، تینوں مل کر شکار پر نکلے، ظاہر ہے کہ شیر بڑا جانور ہے، اسی نے شکار کئے، اس نے تین جانور مارے، ایک نیل گائے، ایک ہرن اور ایک خرگوش، شکار سے فارغ ہوکر اس نے بھیڑیئے سے کہا کہ اسے ہمارے درمیان تقسیم کردو، بھیڑیئے نے کہا کہ اچھا حضور ابھی تقسیم کئے دیتا ہوں، معاملہ تو بہت سہل ہے، حضور بڑے ہیں اور نیل گائے بڑی ہے، اسے آپ تناول فرمائیں، لومڑی چھوٹی ہے خرگوش بھی چھوٹا ہے اسے لومڑی کھالے، میں درمیانی ہوں، آپ سے چھوٹا اور لومڑی سے بڑا، اور ہرن درمیانی ہے اسے میں کھالیتا ہوں، شیر نے دیکھا کہ میرے ہوتے ہوئے یہ اپنے کو بھی کسی گنتی میں رکھتا ہے، اسے بہت غصہ آیا، اس نے ایک زوردار تھپڑ بھیڑیئے کو رسید کیا، وہ تو زخمی ہوکر دور جا گرا، میرے ہوتے ہوئے بھی اس کی اپنی بڑائی قائم ہے، پھر اس نے لومڑی سے کہا کہ تو تقسیم کر، یہ معاملہ دیکھ کر لومڑی کی عقل روشن ہوچکی تھی، اس نے کہا حضور خرگوش چھوٹا جانور ہے، اسے آپ ناشتہ میں تناول فرمالیں، دوپہر کے کھانے میں ہرن کو رکھ لیں، اور شام کے کھانے میں صبح تک چونکہ لمبا وقفہ ہوتا ہے، اس لئے شام کے واسطے نیل گائے مناسب رہے گی۔ شیر کو یہ تقسیم پسند آئی، وہ ہنسا اور پوچھا کہ تم کو یہ عقل کہاں سے آئی، بہت عمدہ تقسیم کی۔ کہنے لگی ان کے حال سے جو گرے پڑے ہیں۔ اگر آپ پہلے مجھی سے تقسیم کراتے تو شاید میں بھی یہی تقسیم کرتی، اس معاملہ سے میری عقل کھل گئی۔

اس واقعہ سے دو نتیجہ نکلتا ہے، ایک یہ کہ اگلی قومیں جو ہم سے پہلے نافرمانیوں میں مبتلا ہوکر ہلاک ہوئیں اور قرآن کریم نے ان کے واقعات نقل کئے ہیں، یہ ہمارے اوپر بڑا احسان ہے، ان کے حالات سے ہمیں سبق لینا چاہئے، جیسا کہ لومڑی نے سبق لیا، بھیڑیئے کی حالت سے۔ اور اگر ہم گذشتہ اقوام کی بربادیوں سے سبق نہ لیں تو اس کا

مطلب یہ ہوا کہ ہماری حالت لومڑی سے بھی گئی گذری ہے، اور دوسرا یہ کہ آدمی کسی بڑے کے ہوتے ہوئے اپنے کو بڑا سمجھتا ہے تو یونہی مار کھاتا ہے۔ اب بتائیے کہ خداوند عالم سے بڑا کون ہے؟ اور کون ہے جو خداوند عالم کے سامنے نہیں؟ خدا موجود ہے، وہ ہر جگہ ہم کو دیکھ رہا ہے، ہر وقت ہم اس کے سامنے ہیں، اگر اس کے بعد بھی کوئی اپنے کو بڑا سمجھے تو اس سے زیادہ ذلیل کوئی نہیں، خدا کی نگاہ میں اس سے زیادہ سزا کا مستحق کوئی نہیں، وہ جہنم میں ہی جانے کا مستحق ہے۔ حدیث شریف میں ہے: الکبریا ء ردائی و العظمة إزاری ، بڑائی میری چادر ہے اور عظمت میری ازار ہے، فمن نازعنی واحداً منهما أدخلته النار، جو ان دونوں کے بارے میں مجھ سے نزاع کرے گا اسے جہنم میں داخل کروں گا، اور ایک روایت میں یہ لفظ ہے: قذفته فی النار ، اسے جہنم میں پھینک دوں گا، آپ ارشاد فرماتے ہیں: ونسی الکبیر المتعال، جو سب سے بڑا ہے اور سب سے بلند ہے اسے بھول جاتا ہے۔ اور فرماتے ہیں: بئس العبد عبد تجبر و اعتدیٰ، برا ہے وہ بندہ جو اپنے کو زبردست بنتا ہے اور زیادتی کرتا ہے، نسی الجبار الاعلیٰ، اور بھول جاتا ہے سب سے بڑھ کر زبردست کو، اللہ ہے سب سے زبردست اسے بھول جاتا ہے، بئس العبد عبد سها و لهانسی المقابر والبلیٰ ، برا ہے وہ بندہ جو غافل ہو گیا اور کھیل کود میں لگ گیا، اور بھول گیا قبروں کو اور شکستگی کو۔ قبر میں جائے گا، جوڑ جوڑ الگ ہو جائے گا، اسے بھول گیا۔ اور ارشاد فرماتے ہیں: بئس العبد عبد عتا و طغیٰ ، برا ہے وہ بندہ جو سرکشی کرتا ہے اور طغیان اٹھاتا ہے، نسی المبتدأ والمنتهیٰ ، اور اپنی ابتدا اور انتہا بھول گیا، ابتداء میں کیا تھا اور انتہاء میں کیا ہو گیا۔

حضرت مالک بن دینار رحمۃ اللہ علیہ کہیں تشریف لے جا رہے تھے، بصرہ کا حاکم اس وقت ایک نہایت مغرور و متکبر شخص تھا، بات بات پر لوگوں کو موت کے گھاٹ اتار دیتا تھا، راستہ میں اس کی ملاقات مالک بن دینار سے ہو گئی، حضرت مالک بن دینار کسی خاص

حال میں چلے جا رہے تھے، انھوں نے اس کو سلام نہیں کیا، حاکم کو بڑا طیش آیا، اس نے بھر کر اپنے مصاحب سے پوچھا یہ کون ہے؟ مصاحب حضرت مالک بن دینار کا معتقد تھا، اس نے سوچا مفت میں ابھی ان کی جان چلی جائے گی، اس نے اس کا غصہ ٹھنڈا کرنے کے لئے کہا کہ حضور یہ مالک بن دینار ہیں، بصرہ کے سب سے بڑے عابد وزاہد، انھوں نے حضور کو پہچانا نہیں ورنہ ضرور سلام کرتے، حضرت مالک بن دینار کھڑے ہوگئے اور فرمایا کہ مجھ سے زیادہ اس شخص کو کون پہچانے گا، میں اسے خوب پہچانتا ہوں، پھر جن لفظوں میں اس کا تعارف کرایا وہ سننے کے قابل ہے، فرماتے ہیں: أوله نطفة، اس کی ابتداء تو ایک ناپاک قطرہ ہے، ظاہر ہے کہ انسان ایک ناپاک قطرہ ہی کی ترقی یافتہ شکل ہے، آخره جيفة، اور آخر میں مردار ہوجائے گا، وبينهما قذرة وعذرة، اور دونوں کے درمیانی وقفہ میں کچھ نجاست اور کچھ گندگی لئے پھرتا ہے، ظاہر ہے بدن میں دوڑنے والا خون بھی نجس، اور پیٹ میں بھری ہوئی غلاظت بھی ناپاک ہے۔ اسی کی طرف حضرت مالک بن دینار نے اشارہ فرمایا، بصرہ کا حاکم اس بات کو سن کر سناٹے میں آگیا اور خاموشی سے چلا گیا۔

اسی کو حضور ﷺ فرماتے ہیں: بئس العبد عبد عتا وطغىٰ، برا ہے وہ بندہ جو سرکشی کرتا ہے اور طغیان اٹھاتا ہے، نسي المبتدأ والمنتهىٰ، اور اپنی ابتدا اور انتہا بھول جاتا ہے، اور ارشاد فرماتے ہیں: بئس العبد عبد طمع يقوده، برا ہے وہ بندہ جس پر ایسی حرص اور لالچ مسلط ہے کہ وہ اسی حرص اور لالچ کے پیچھے لگا رہتا ہے، بئس العبد عبد هوى يضله، برا ہے وہ بندہ جس کو اس کی خواہش نفس گمراہ کرتی ہے اور بھٹکاتی پھرتی ہے، بئس العبد عبد رغب يذله، برا ہے وہ بندہ جو کسی چیز کی رغبت اور عشق میں پڑ کر ذلیل ہوتا پھرتا ہے، اللہ کے علاوہ دل میں کسی چیز کی رغبت نہ ہونی چاہئے، اور اگر دنیا کی رغبت کسی شخص کے دل میں گھس گئی ہے تو وہ بہت برا بندہ ہے۔

تکبر ہمارے زمانہ کا خاص مرض ہے، اس مرض کی قباحت اور شناعت ظاہر کرنے

کے لئے میں نے یہ حدیثیں آپ کو سنا دیں، آپ سمجھئے کہ یہ کتنی بری چیز ہے، اسی کو ہمارے حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب نور اللہ مرقدہٗ فرماتے تھے کہ اگر انسان کو تکبر اور اس کی غلاظت کا اِدراک ہو جائے تو اسے قے آ جائے گی کہ اُف کس قدر گندی چیز ہے، تکبر کے ہوتے ہوئے انسان جنت کا مستحق نہیں ہوتا۔ اسی کو اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: **تِلْکَ الدَّارُ الْآخِرَۃُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِیْنَ لَا یُرِیْدُوْنَ عُلُوًّا فِی الْاَرْضِ وَلَا فَسَادًا وَّالْعَاقِبَۃُ لِلْمُتَّقِیْنَ**، یہ عالم آخرت ہم ان لوگوں کے لئے خاص کرتے ہیں جو دنیا میں نہ بڑا بننا چاہتے ہیں اور نہ فساد کرنا، اور نیک نتیجہ متقیوں کے لئے ہے، آگے ارشاد فرماتے ہیں: **مَنْ جَاءَ بِالْحَسَنَۃِ فَلَهٗ خَیْرٌ مِّنْهَا**، قیامت کے دن جو کوئی نیکی لے کر آوے گا اس کو خدا تعالیٰ کے یہاں بدلہ اس سے اچھا ملے گا، کر کے تو آؤ، یہاں نفع کا سودا ہے نقصان کا سودا نہیں ہے، تم ذرا سا عمل کر کے آؤ گے تو ہم اس سے بہتر اجر دیں گے۔ **وَمَنْ جَاءَ بِالسَّیِّئَۃِ فَلَا یُجْزَی الَّذِیْنَ عَمِلُوا السَّیِّاٰتِ اِلَّا مَا کَانُوْا یَعْمَلُوْنَ**۔ اور جو کوئی برائی لے کر آوے گا، کسی طرح کا گناہ لاوے گا تو یہ سمجھ لو کہ جتنا گناہ کیا ہوگا اتنا ہی بدلہ دیں گے، اس سے زیادہ نہیں دیں گے۔ نیکی کا بدلہ تو زیادہ دیں گے اور برائی کا بدلہ اسی کے بقدر دیں گے، بلکہ بہت سا تو معاف کر دیں گے۔

اب آپ سمجھ لیجئے کہ کبر کے بارے میں قرآن وحدیث میں یہ جو وعید آئی ہے کہ متکبر جنت کا مستحق نہیں ہے، اس سے معلوم ہوا کہ تکبر اتنا بڑا گناہ ہے کہ اس کا پورا بدلہ یہی ہے کہ انسان جنت سے محروم کر دیا جائے اور جہنم میں جائے، اور اس میں کوئی زیادتی اس کے اوپر نہیں کی جا رہی ہے، خدا کی عظمت وکبریائی کے ہوتے ہوئے اگر کوئی شخص اپنے دل میں بڑائی محسوس کرتا ہے تو وہ ایسی ہی سزا کا مستحق ہے، جس کا ذکر قرآن وحدیث میں آیا ہے، اللہ تبارک وتعالیٰ ہم کو اس بیماری سے محفوظ رکھیں، جہنم سے بچائیں اور جنت میں جگہ عطا فرمائیں۔ آمین وآخر دعوانا أن الحمد للہ رب العالمین